ہے۔وہ بتایا کرتا کہ پٹھ کا گوشت کس سبزی میں پڑے گا،گردن کا شوربہ اور دستی کا حلیم کیسے تیار ہوتا ہے۔ران کے روسٹ کی ترکیب کس نائی نے اسے سکھائی تھی؟پسندے کٹوانے سے پہلے کیا احتیاطی تدابیر قصائی کو بتانا ضروری ہیں؟چانپ کو کیسا مسالہ لگایا جائے؟.....اسے شاہی باورچی ہونا چاہئے تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ سارا علم کتابی تھا۔ جسکے کی حد تک وہ یہ ساری انفرمیشن دے سکتا تھا ورنہ نہ تو اس نے کبھی باورچی خانے کی شکل دیکھی تھی،نہ کبھی کسی نے اسے باورچی خانے میں گھسنے دیا تھا۔وہاں پر بڑھیا زینب کا ٹکٹ سکہ چلتا تھا۔

ٹھنڈی کافی کے گھونٹ وہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد پی رہا تھا۔

''یار ابھی مائیکرو اون میں گرم کرلاتا ہوں.....''

''بس ٹھیک ہے.....''

کافی کے بعد وہ کچھ دیر خالی الذہن ہونق سا بیٹھا رہا۔

''یار چلو سیر کے لئے چلیں۔واپسی پر آئس کریم کھائیں گے.....''

اس کے چہرے پر ایسی ناگواری آئی جیسے میں نے کوئی گالی دے دی ہو۔

''نہیں.....''

''کیا بات ہے.....؟''

''بس موڈ نہیں ہے.....''

''یہ کیا بے ہودہ ٹنکا رہے۔اٹھو چلیں.....''

وہ غصے سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔چند لمحے بعد اس کی کار سٹارٹ ہوگئی۔پتہ نہیں کیوں میں نے بھی باہر جانے کی زحمت نہ کی۔میں اس کے کافی لا ڈسہہ چکا تھا اور اندر ہی اندر میں نے بھی کچھ شکایتیں پال رکھی تھی۔

چند دن اپنے اپنے انتر بھاؤ میں گزر گئے۔پھر ایک رات گئے اس کا فون آگیا۔

''وہ میں کل آؤں گا.....تم سے کچھ بات کرنا ہے''

''کب آؤ گے.....''میں نے رسان سے پوچھا

''مغرب کے بعد.....''

وقت بتانے کا یہ طریقہ مجھے اس کے منہ سے عجیب لگا۔پھر بھی میں ہمیشہ کی طرح انتظار کی چرخی سے بندھ گیا۔وہ مغرب کی اذان سے ٹھیک آدھ گھنٹہ بعد حاضر ہو گیا۔ اس نئے قانونیے کا چہرہ آج پہلے سے بھی زیادہ مدقوق نظر آرہا تھا۔دبلا پتلا، سنیک سلائی عارفین مجھے اصلی عمر سے زیادہ لگا،اس کے ہونٹ دونوں جانب لٹک رہے تھے .....آنکھیں نم تھیں۔ماتھے کی لکیریں بہت نمایاں نظر آرہی تھیں اور پہلے بار مجھے لگا کہ کسی چونکیل جانور کی طرح اس کے کان کلوں سے باہر نکل آئے تھے۔

میں نے عارفین کا ہاتھ پکڑ لیا۔اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا اور تر بتر تھا، یہ پسینہ نہیں تھا۔موت سے پہلے کی ٹھنڈی تریلی تھی۔ہم دونوں جب اندر پہنچے تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ کچھ کانپ بھی رہا تھا۔

''بیٹھو کیا ہوا؟.....''

عارفین کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

''کچھ نہیں۔تاش نکالو''

میں نے اس سمپورن اداسی سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور تاش پھینٹنے لگا۔اس کی نگاہیں تاش کے پتوں پر نہیں تھیں۔وہ کھڑکی سے باہر لان میں کچھ دیکھ رہا تھا۔

''چال چلو.....''

اس نے اپنا پتہ چھانٹ کر پھینک دیا اور ڈھیری میں سے نیا پتہ نکالا۔دو تین ہاتھ میں ہی اس کی رمی بن گئی اور اس نے شو کرا دیا،لیکن اس جیت نے اسے رتی بھر خوشی نہ دی،اس کا چہرہ کسی پرہیز گار بوڑھی عورت کی طرح جھریوں بھرا تھا۔وہ بے یار و مددگار انداز میں بدلا ہوا نظر آرہا تھا۔ہم نے دو چار بازیاں کھیلیں اور ہر بار وہی جیتا۔اگر وہ پہلے والا عارفین ہوتا تو کسی پاگھنڈی کی طرح، کبھی اچھلتا، کبھی تالیاں بجاتا، کبھی مجھے

چھپیاں دیتا لیکن اب وہ خیانت کرنے والے بد نیتی کی طرح مجھ سے آنکھیں چرا رہا تھا۔

میں نے تاش جمع کر کے ایک طرف رکھ دی اور معذرت سے بولا.....

''عارفین میں تمہارا پگڑی بدل دوست نہ سہی، لیکن میں تمہارا خیر خواہ ضرور ہوں۔ مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے''۔

''تم کچھ نہیں کر سکتے۔ بتانے کا فائدہ؟.....''

''چلو..... اور کچھ نہ کر سکا تمہارے دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا''

''یہ ایسا کلیش ہے جس کا کوئی علاج نہیں.....''

''چلو تم بیان تو کرو..... بھائی''

آنکھیں موند کر اس نے سر کرسی سے ٹکا لیا..... ''ہر عہد کی اپنی آزمائشیں اپنے دکھ ..... بچپن میں کھیلنے کو نہ ملے تو دکھ..... جوانی میں محبوبہ کا روگ لگا رہے ہو گھڑی..... پھر شادی رچا لے بڑی امید کے ساتھ اور بیوی گھاس نہ ڈالے۔ گرہست کی کڑکی میں مرا ہوا چوہا بن کر گزارے ساری ادھیڑ عمر، لیکن یہ دکھ کچھ بھی نہیں۔ بڑھاپے کا دکھ تو ایسے ہے میاں، گویا بیلنے میں سارا وجود آ گیا ہے''۔

میں چپ رہا۔ میرا خیال تھا ہنکارا بھرنے سے وہ چپ ہو جائے گا۔

''اولاد اور مال کی آزمائش تو سب سے بڑا دکھ نکلا۔ گھوڑا گھڑ دوڑ کی ہر ٹٹی ٹاپ سکتا ہے، لیکن اولاد کی آزمائش کو نہیں ٹاس سکتا..... ہمایوں''۔

اس کے بعد اس نے مجھے آہستہ آہستہ اپنے بیٹے خلیل کے متعلق بتانا شروع کیا۔ وہ اسلام آباد میں فیڈرل حکومت کا بہت ہی سینئر افسر تھا اور اس پر لاکھوں کے غبن کا کیس تھا۔ اس وقت اسے Suspend کر کے انکوائری چل رہی تھی اور ابلتے دودھ کے جھاگ کی مانند اس کی چھوٹی بڑی برائیاں بڑھ چڑھ کر اخباروں میں چھپ رہی تھیں۔ پتہ چلا کہ وہ ہاؤس ارسٹ میں تھا۔ اس کا پاسپورٹ ضبط ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔

عارفین کی باتوں سے احساس ہوا کہ خلیل خاں نے جو فاختائیں اڑائی تھیں، اسے مہنگی پڑیں۔ اب نوکری بھی جاتی نظر آتی تھی۔ اوپر سے جس عزت کو حاصل کرنے کے لئے اتنے داؤ پیچ کھیلے تھے، وہ خاک میں مل گئی۔ عارفین تو اس قدر خوفزدہ نظر آتا تھا کہ اسے دیکھ کر لگا کہ خلیل خاں کو اگر جیل ہوگئی یا مقدمہ چلا..... یا جائیداد ضبط ہوئی تو وہ خبر سنتے ہی عارفین فوت ہو جائے گا۔

''کہتا ہوں..... جب جب اسلام آباد گیا سمجھایا اپنی بہو صوبیا کو کہ اتنے ٹھاٹھ ٹھیک نہیں۔ اکیسویں گریڈ کے افسر کی اتنی تنخواہ نہیں ہوتی کہ وہ دو کاریں، چار ملازم اتنی سوشل لائف رکھے..... یہ جاگیرداروں کارخانے والوں کے چونچلے ہیں تو پتہ ہے صوبیا کیا کہتی تھی۔ ابا جی! آپ فکر نہ کریں۔ ہم افورڈ کر سکتے ہیں۔ پھر جس سرکل میں ہم Move کرتے ہیں، ان کا یہی معیار زندگی ہے۔ اب ہم اردو میڈیم سکول میں تو بچے نہیں بھیج سکتے ناں..... آپ کو پتہ ہے تنخواہ میں سے تو صرف بچوں کی فیس جاتی ہے یوٹیلیٹی بلز بھی پورے نہیں ہو پاتے''۔

''تم فکر نہ کرو..... اللہ مالک ہے۔ وہ کوئی صورت نکالے گا..... دیکھتے جانا کوئی نہ کوئی ہادی ہاتھ پکڑے گا'' عارفین کو میں اعتقاد کے بغیر تسلی دیتا۔

''ہاں جی..... وہی آخری سہارا ہے..... میں تو کسی منسٹر وغیرہ کو بھی نہیں جانتا اللہ سن لے تو عزت رہ سکتی ہے ورنہ.....'' نمود کا ڈرایا عارفین نڈھال ہو کر جواب دیتا۔

یہاں سے بڈھا اور بھگوان کی کتھا شروع ہوتی ہے..... ساری عمر جس عارفین نے مسجد کا رخ صرف عیدین پر کیا تھا، اب ساری نمازیں مسجد میں پڑھنے لگا۔ عارفین کی کچھ ایسی کایا کلپ ہوئی کہ دنیاوی دارو نہ ملا تو ہر فقیر کے پیچھے بھاگنا، ہر شاہ صاحب سے تعویذ لکھانا، درگاہوں پر حاضری دینا، مسجد میں چٹائیاں بچھانا، نمازیوں کی جوتیاں قطار میں رکھنا، درگاہوں پر جھاڑو پھیرنا، داتا دربار میں دیگیں نذر کرنا..... وظیفے پڑھنا، محفل میں بیٹھ کر تسبیح پھراتے رہنا اس کا وطیرہ ٹھہرا۔ عارفین کی زندگی کا نقشہ

بدل گیا..... اولاد کی آزمائش نے گویا اس بنڈیلے کو بکری بنا دیا۔ اس بنی آدم کے لئے اولاد کی آزمائش، مال کی آزمائش میں بدلی۔ جگہ جگہ عارفین کو شنوائی کے لئے رشوت سفارش کے لئے بھاری رقموں کی ضرورت پڑی۔ اولاد اور مال کی آزمائش میں پھنس کر بیچارہ قرے کا بہکایا اور جوگی کا پھٹکارا آخری عمر میں ایسی دلدل میں پھنس گیا کہ ساری تاش، شطرنج دھری کی دھری رہ گئی اور عارفین نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔

کچھ دیر کے بعد میں صرف عارفین کو تلاش کرتا رہا۔ پہلے پتہ چلا اسلام آباد میں ہے ..... پھر کسی نے بتایا ہے تو اسلام آباد میں ہی، لیکن بری امام کے پتھروں میں بھٹکتا پھرتا ہے..... نہ کسی سے بات کرتا ہے، نہ کسی کو پہچانتا ہے۔ حلئے سے بھی پہچانا نہیں جاتا!

نیگرو لوگ گایا کرتے ہیں

سوچتا ہوں میرا بھائی گیا کہاں

سوچتا ہوں میرا بھائی گیا کہاں

جنگلوں میں کھو گیا شاید

آئے گا اب کہاں؟

جانے کہاں وہ لیٹے گا

جانے کہاں بکھروں گا میں

مالک کسی اداس جگہ میں

زمین پر ڈھیری کی صورت

گر کر اسے پاؤں گا

کیا پہچانوں گا اسے

میرا بھائی گیا کہاں

میں لکڑی کی کنیا جسے امریکن گزے بو کہتے ہیں، میں بیٹھا نیچے ترائی کے جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس جنگل کا سبزہ بہت خوش رنگ ہے۔ درختوں کے تنے سیاہ اور

شاخیں تازہ سیبوں کے رنگ جیسی ان پر موٹی موٹی گلہریاں بڑی آزادی سے چڑھتی اترتی نظر آتیں، کبھی کبھی کوئی پرندہ اچانک درخت سے نکلتا اور بلندیوں کی طرف اڑان بھرتا۔

ہر طرف شانتی تھی، چونکہ اس دیس میں بلاوجہ ہارن بجانا گالی دینے کے مترادف ہے۔اس لئے گاڑیوں کے چلنے کی آواز تو آئی، لیکن بریکیں لگنے یا ہارن بجنے کا شور زیادہ نہیں تھا۔پھر ایک پاکستانی عورت نہ جانے کس بلاک یا سپر مارکیٹ کی جانب سے چلتی ہوئی اچانک وارد ہوگئی۔ مجھے اس کے ورود کا علم نہ ہوا.....ٹوٹی بیساکھی پر سہارا پاکر وہ بولی۔

''میں یہاں بیٹھ جاؤں چاچا جی.....''

مجھے چاچا جی القاب سن کر ذرا سی ناگواری محسوس ہوئی، کیونکہ وہ عورت پچاس سے کم نہ تھی، پھر یہ سوچ کر ارجمند اور بلال کی ٹھوڑیاں بھی دوہری ہوکر ڈھلکنے لگی ہیں، میں چپ ہوگیا۔

یہ سرکاری گزے بو ہے۔آپ شوق سے جہاں چاہے بیٹھیں.....بٹی۔''

اس نے اپنی خریداری کے چند لفافے بنچ پر رکھ دیئے اور آہستہ سے بولی.....''میں بہت دور سے آپ کو دیکھ کر آئی ہوں..... یہاں تو اتنی تنہائی ہے کہ کوئی مشورہ دینے والا بھی نہیں''۔

''آپ خود بہت سمجھ دار ہیں۔آپ کو مشورے کی کیا ضرورت ہے.....اور پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انسان مشورہ لے تو لیتا ہے، اس پر عمل نہیں کر پاتا۔یہ انسانی مجبوری ہے۔وہ اپنے سے زیادہ کسی کو عقل مند نہیں سمجھتا''

''نہیں چاچا جی.....میری آرزو ہے کہ کوئی مجھے گائیڈ کرے۔میں بڑی مشکل میں ہوں.....''

میں یکدم اپنے آپ کو اہم سمجھنے لگا.....

''ہاں ہاں فرمائیے فرمائیے۔ اگر میں کوئی چارہ جوئی کر سکا تو مجھے خوشی ہوگی''۔

وہ بھی بشاش سی نظر آنے لگی۔ گویا میں اس کی اصلی مدد کرنے والا تھا۔

''بات یہ ہے چاچا جی.....'' پھر وہ رکی، گروسریز کے ایک لمبے لفافے میں سے جس میں Cereals کے ڈبے تھے، اس نے بازو گھسا کر ایک چوکولیٹ نکالا۔

''آپ کو Hazel Nuts پسند ہیں۔ یہ چوکولیٹ پیکن اور ہیزل نٹز سے بنا ہے''۔

منہ کے ذائقے کو بھڑکانے کے لئے انسان گندم کے دانے سے چل کر کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔

''شکریہ.....'' میں نے چوکولیٹ کا برانڈ پڑھا۔ اسے ناک سے لگا کر سونگھا اور شکریہ کہہ کر ریپر کھولنے لگا۔

''یو آر ویلکم..... چاچا جی بات یہ ہے کہ میرے دو بیٹے ہیں اور وہ دونوں امریکہ میں ہیں۔ بڑا سکندر تو یہاں ایک معمولی سے سٹور میں کام کرتا ہے اور چھوٹا اختر پڑھ رہا ہے انجینئر سکول میں.....''

امریکہ میں کالج کی تعلیم کو عموماً سکو جانا کہتے ہیں۔

''بڑی خوشی کی بات ہے.....''

''بظاہر تو خوشی کی بات ہے ہی چاچا جی..... لیکن میرے لئے بہت مشکل کا سامنا ہے''۔

اس کی باتوں سے زیادہ چوکولیٹ مزے دار تھی۔

''میرے میاں ان کے یہاں پر رضامند نہ تھے۔ ہم لوگ پیچھے سے بڑے سوکھے ہیں چاچا جی، دو پلازہ تو گلبرگ میں ہیں۔ اندرون شہر بھی پراپرٹی ہے۔ شیخ جی کہتے تھے کہ تم کو باہر جا کر کیا ملے گا۔ دھکے محنت مزدوری، بھانڈے کپڑے دھونا، آرام سے رہو..... جیسے سارے خاندان کے لوگ رہتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے دوست یہاں آ گئے..... سکندر کو تو ڈھنگ کا کام بھی نہیں ملا، لیکن وہ واپس نہیں جاتا۔ اس کا ابھی

تک گرین کارڈ نہیں بن سکا اور وہ کبھی ایک وکیل پکڑتا ہے کبھی دوسرا۔ آج کل وہ ایک پیپر میرج کے چکر میں ہے۔"

"خود ہی تھک جائے گا اس مشقت سے تو لوٹ جائے گا وطن....."

"وہ بھی یہی کہتا ہے لیکن شیخ صاحب کی جھوک مجھ سے سنبھالی نہیں جاتی۔ وہ مجھے بدو بدی بھیج دیتے ہیں یہاں بیٹوں کو منانے..... جب میں اکیلی واپس جاتی ہوں تو گھر میں چوکھی لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ سارا الزام ہی مجھ پر دھرتے ہیں"۔

میں نے سقراطی سے لہجے میں کہا..... "تم ایسے کرو عزیزہ۔"

"آپ کو میرا نام کیسے پتہ چلا....." وہ کھل اٹھی

"بس ایسی باتوں کا علم ہو جاتا ہے" ڈبہ پیر کے سے لہجے میں جواب دیتے ہوئے میں نے کہا..... "تم عزیزہ ایسے کرو..... اپنے شیخ صاحب سے کہو جا کر خود بچوں کو راہ پر لائیں"۔

"آئے تھے چار سال پہلے۔ ہم دونوں آئے تھے۔ پہلے منتیں سماجتیں کیں۔ پھر دھمکیاں دیں..... آخر میں عاق کرنے کا فیصلہ بھی سنایا، لیکن الو کے پٹھے مانے نہیں۔ شیخ صاحب تو بھوں بھڑک واپس چلے گئے دس دن کے بعد ہی..... میں مہینہ بھر ٹھہر کے لوٹی تب سے آج تک وہ اٹھتے بیٹھتے طعنے مہنے دیتے ہی رہتے ہیں..... ان کا خیال ہے کہ دونوں جو بھٹکے ہیں تو یہ میری کارگزاری ہے۔ بتائیں میں کیا کروں؟ بڑا تو پھر بھی لیگل امی گرنٹ ہے۔ چھوٹے کے پاس تو گرین کارڈ بھی نہیں۔ ایک حلال گوشت کی دوکان پر کام کرتا ہے اور آدھی اجرت لیتا ہے، لیکن واپس نہیں چلتا۔ کیا کروں چاچا جی۔"

میرے دل میں آئی کہ کہہ دوں، کرنا کیا ہے بی بی عزیزہ، صبر کرو شکر کرو..... اولاد کی آزمائش سہو اس عمر کے یہی میوے ہیں لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر ہمت نہ پڑی اور میں چپ رہا۔

''وہاں لاہور میں رہتی ہوں تو ان دونوں کی یاد دل میں ٹسکتی رہتی ہے۔ یہاں آؤں تو شیخ جی کا خوف جینے نہیں دیتا.....'' شیخ جی واپسی پر کہتے ہیں، اگر بچوں نے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو تم بھی انہیں چھوڑ دو..... وہ چاہتے ہیں کہ ہمیں ان کے سہارے جیوں، صرف ان کا سوچوں اور وہی میری ساری دنیا ہوں..... ان کی ڈیمانڈ بھی ٹھیک ہے۔ وہ بھی درست کہتے ہیں۔ لیکن میں بیٹوں کا تعلق کیسے توڑوں چاچا جی..... ان دونوں کو دل سے کیسے نکالوں..... کوئی ترکیب بتائیں چاچا جی.....

مشورہ دینے والے کے لئے سب سے بڑا مرحلہ یہی ہوتا ہے، جب وہ جواب نہیں جانتا۔

''دراصل عزیزہ تمہارا کوئی قصور نہیں..... یہ تعلق چیز ہی ایسی ہے۔ انسان کو بھگل کر دیتا ہے..... صوفیا تو کہتے ہیں کہ رستے کا سب سے بڑا حجاب ہی تعلق ہے۔ نہ تعلق سے دل خالی ہوتا ہے، نہ اصلی قرار دل میں آتا ہے۔ معمولی سے مہمان کے لئے کمرہ خالی کرنا پڑتا ہے۔ پھر اوپر والے کے لئے تو چھوٹا سا بت بھی اندر رہ جائے تو اس کی سواری نہیں اترتی.....''

وہ کچھ نہ سمجھی

''چلو نہ جائیں پاکستان..... ان کی مرضی..... ان کو آزادی من مرضی کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ کہاں چلتے ہیں میرے ساتھ..... نہ سہی..... چلیں اللہ کرے میں ہی ان کے پیچھے نہ کلپتی پھروں..... بتائیں چاچا جی..... تعلق کو توڑنے کا کوئی نسخہ جلدی بتائیں ورنہ میں تو نہ یہاں خوش نہ لہور میں۔''

اب عزیزہ کے آنسو جھرنے کی طرح بہنے لگے۔ میں نے اسے بتانا چاہا کہ ہم جیسے گوشت پوست کے بنے معمولی لوگوں کے تعلق ٹوٹا نہیں کرتے۔ کوئی ساتھ رہے یا خواب بن کر خیالوں میں بس جائے..... تعلق جان لیوا ہوتا ہے..... میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ تو پھر ماں ہے اور بیٹوں کو گنوائے بیٹھی ہے۔ میں نے تو ایسے ہی ایک

بدلی بھرا اقبال پر نگاہیں جما کر عمر گزار دی..... جبکہ یہاں وہاں کبھی بھی کچھ نہ تھا۔

جمشید اور قیصر دور سے بھاگتے ہوئے میری جانب آئے۔

''نانا۔نانا..... ہم واشنگٹن ڈی سی جا رہے ہیں۔جلدی آجاؤ چاچا نثار، ہمارا انتظار کر رہے ہیں.....''

''حوصلہ کرو عزیزہ ہمت پکڑو..... سوائے دعا کے میں تمہیں اور کوئی نسخہ نہیں دے سکتا۔اس عمر میں اولاد اور مال کی آزمائش آیا ہی کرتی ہے..... اور جن مسائل کا حل نہ ہو، سوائے دعا کے اور کیا تجویز کروں ان کے لئے.....''

''نانا..... نانا..... بابا..... نے کار آن کر دی ہے.....''

دور سے قیصر چلایا۔

''وہ سب کو ڈانٹ رہے ہیں۔جلدی کریں.....''

ہم واشنگٹن ڈی سی کی طرف جا رہے تھے۔راستے میں یو ایس راؤٹ آیا، کئی ایگزٹ آئے، میجر آئے، کئی جگہ ہم نے Hov کا راستہ اختیار کیا..... باہر نظریں دوڑاتا میں سوچ رہا تھا کہ امریکہ کو یورپ والوں نے طعنے دیئے تھے کہ امریکی بھی کوئی لوگ ہیں۔جن کا نہ کوئی کلچر، نہ کوئی زبان، نہ ان کی ہسٹری، نہ ان کے آثار قدیمہ۔اس خودرو گھاس جیسی جنگلی تہذیب کے مالکوں نے ثقافتی برتری والوں کا تکبر ریزہ ریزہ کر دیا۔پتہ نہیں کیا بات ہے۔جب ہم کسی میں کیڑے نکالنے کے مسلسل عمل میں ہوتے ہیں تو کہیں ہوا میں سے ان کیڑوں کا پولن ہماری اپنی ذات پر بھی جھڑنے لگتا ہے۔آج امریکہ کی جدیدیت ہی سارے پرانے کلچروں کو کھا گئی۔امریکہ کی ہسٹری ان کی سڑکیں اور بازار ہیں۔ان کی امریکن زبان ساری زبانوں کو اکھاڑے میں پچھاڑ چکی ہے۔حتیٰ کہ جو انگریزی انگریزوں کی دستار تھی، وہ بھی اسے اتار کر امریکنوں کے قدموں میں رکھ چکے ہیں۔

آسمان پر ایک چھوٹی سی اقبال مند بدلی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔یہ بدلی

کبھی اقبال کا دوپٹہ بن جاتی، کبھی اس کے سینڈلوں کا روپ دھار لیتی..... میں سوچتا چلا جاتا ہوں۔ یہ کیسا تعلق ہے جو بلاوجہ بے نام ایک خلش کی طرح میرے ساتھ چلتا ہی چلا آیا..... اس تعلق نے میری روزمرہ کی زندگی میں کوئی کھنڈت نہ ڈالی۔ میرے گرہست آشرم کو برباد نہ کیا اور پھر بھی..... کار سے نظر آنے والے منظر کی طرح یہ ساتھ ہی رہا۔

میں نے ہال روڈ کی دوکان سے ڈیفنس کی کوٹھی تک دنیاوی زندگی کے لئے جدوجہد میں وقت گزارا اور کبھی پٹ سیاپا نہیں ڈالا پھر بھی.....

نہ میرا کوئی رازداں تھا، نہ ہی کسی کو علم ہو سکا۔

اور پھر بھی.....

یہ کیسا تعلق تھا اصغری؟ تم تو صرف مامتا کو سمجھ سکی ہو۔ میں تو اس تعلق کا کوئی نام بھی نہیں رکھ سکتا جو میں اقبال کے لئے محسوس کرتا رہا۔

کار تیز تھی۔

خیالات تیز تر..... میں بھی بچوں کی طرح مناظر دیکھنے سے قاصر تھا۔ میں ٹریڈ منسٹر سے ملنے ایمبسی نہیں جانا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرے من کا موتی لانگ آئی لینڈ چلا گیا ہے۔ اگر میں جہانگیر کیگھر جا کر تصدیق کر سکتا تو بات پایہ ثبوت کو پہنچ سکتی تھی۔ لیکن میں نیتو بیٹھے بٹھائے ہیجانی من موجی فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے تو شاہدہ کو بھی ایک بار پھر اپنے سے دور کر لیا تھا۔ ہارون کو بھی دیکھنے میں نہ جا سکا، کیونکہ وہاں کی اقبال لانگ آئی لینڈ چلی گئی تھی۔

بلال اور ارجمند چھوٹی چھوٹی بات پر لمبی لمبی بحث کر رہے تھے۔ بچوں نے ٹیلی ویژن لگا رکھا تھا اور مناظر قدرت دیکھنے کے بجائے وہ میڈیا سے وابستہ تھے..... یکدم میں بھی ایک الٹے ٹریک پر چلنے لگا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ لانگ آئی لینڈ جانے والی وہ اقبال نہ ہو جو آپیا کی دوست

تھی؟..... بڑھاپے میں امید چھوٹی چھوٹے اشاروں سے شگوفوں میں بندھ جاتی ہے اور اس سے بھی کمتر واقعات سے ٹوٹ جاتی ہے۔اب میرے خیال نے ایک نیا جال بننا شروع کر دیا۔ٹریڈ منسٹر نثار کی بیوی ہی اصلی اور وڈھی ہیر ہے..... یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اسے ملنے جا رہا تھا۔شاید ٹریڈ منسٹر کی بیوی ہی اصلی اقبال نکلے۔

یقیناً یقیناً یقیناً یہی اقبال اصلی ہے۔

کیا اقبال موٹی ہو چکی ہو گی.....؟

کیا اس کا چہرہ جھریوں زدہ ہو گا.....؟

کیا اقبال نے بال ڈائی کر لئے ہوں گے.....؟ سنہری سنہری براؤن ہو سکتا ہے اس کے سامنے والے دانت ٹوٹ چکے ہوں.....

یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس کے بارے دانت نقلی ہوں.....

میں نے اس وقت سکھ کا سانس لیا جب ٹریڈ منسٹر کی بیوی اقبال ہی نے دروازہ کھولا.....

یہ وہ اقبال نہ تھی، جسے میں جانتا تھا۔

خوشبو میں بسی ایک بوڑھی عورت رنگ کے سیلاب میں ملبوس تھی۔اس کے سارے تار و پود ڈھیلے اور بناوٹی تھے..... اتنے ڈھیر سارے قیمتی Props کے باوجود وہ قابل ذکر نہ تھی۔آنٹی اقبال ہمارے لئے چائے لینے چلی گئی۔

ارجمند کو انفارمیشن دینے کا بہت شوق ہے۔اس کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ اخبار کی طرح ہمیشہ تازہ خبر دے، چونکا ڈالے، ہر دوائی کا علم رکھتی ہو، وہ پہننے اوڑھنے میں اتھارٹی مانی جائے۔ارجمند نے انفرمیشن کے شوق میں امریکی زندگی کے متعلق اتنی ان گنت باتیں جمع کر رکھی ہیں کہ کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ اس کی سات پشتیں اسی سرزمین میں رہتی رہی ہیں۔وہ نثار کا انٹرویو پیش کرتی ہے۔

''انکل تو بڑی ٹھیک ٹھاک پرسنیلٹی ہے۔بڑی عالی شان باتیں کرتے ہیں، لیکن

وائف میں وہ سپارک نہیں"۔ کمرہ خالی پا کر ارجمند بولی۔

"کیوں"۔

"یوں لگتا ہے آنٹی اقبال سے ان کی شادی زبردستی ہوئی ہے۔ دونوں بیزار سے بیٹھے ہوتے ہیں جیسا اپنے ماضی میں کوئی معنی تلاش کر رہے ہوں....."

میں حیرانہو کر ارجمند کی شکل تکتا ہوں۔

انکل نثار؟ آنٹی اقبال۔

"تمہارے انکل نثار خوبصورت ہیں؟"

"جی ابو بہت..... چھ فٹ ایک انچ قد ہے..... سنا ہے جوانی میں ٹینس کھیلا کرتے تھے....."

میں ذہن میں نثار کی شناخت پریڈ کرنے لگتا ہوں۔ بڑے چھوٹے سپارک سے خیال کی گاڑی سٹارٹ ہو جاتی ہے۔ دراز قد، خوبصورت، ٹینس کا کھلاڑی..... ٹریڈ منسٹر لیکن اب مجھے ٹریڈ منسٹر سے خوف نہیں آتا..... نہ اس کی ٹینس سے نہ اس کے حسن سے.....

"بچے کتنے ہیں انکل نثار کے؟....."

ارجمند مسکراتی ہے..... "پتہ نہیں دو بیٹے ہیں کہ ایک بیٹا ہے۔ بات یہ ہے ابو! یہ امریکی معاشرہ جھوٹ کا عادی نہیں..... جب ہم لوگ پہلے پہل یہاں آیا کرتے تھے تو ہم جس سے ملتے، اس کے بال بچے کا حال ضرور پوچھتے۔ پیچھے سے ہمیں عادت پڑی ہوئی تھی۔ جس سے ملنا بچوں کی بات ضرور کرنا، حالانکہ ہم تو بچوں کے نام تک نہ جانتے تھے، لیکن یہاں آ کر عادت بدل گئی۔ امریکہ میں ہم پرسنل باتیں نہیں کرتے۔ اقبال کو دیکھ لینے کے بعد مجھے ٹریڈ منسٹر کو دیکھنے کی خواہش نہ رہی..... اس کے بچے کتنے تھے، اس کی مجھے رتی بھر پروا نہ تھی۔ یہ میرے والی اقبال نہ تھی۔

واپسی پر کار میں بیٹھا سوچتا جاتا ہوں۔ معاشرتی زندگی میں امریکی تبدیلی کا

خواہاں رہتا ہے۔ یہاں کے لوگ دب دبا کے پانچ دن کام کرتے ہیں، لیکن ویک اینڈ پر ضرور بریک لیتے ہیں۔ چھٹی لینا اور چھٹی منانا ان کا بنیادی حق ہی نہیں، ضرورت بھی ہے۔ وہ ایک ریاست سے دوسری ریاست میں خوشی خوشی جاتے ہیں، نوکریاں تبدیل کرتے ہیں، حتیٰ کہ ساتھی کو تبدیل کرنا بھی ان کے نزدیک کوئی جان لیوا حادثہ نہیں۔

دراصل تبدیلی فطرت ہی کا قانون ہے..... انسان ہمیشہ بچہ نہیں رہتا۔ تبدیلی اسے نوبالغ سے بالغ اور جوانی سے بڑھاپے میں منتقل کر دیتی ہے۔ ایک مدت حالات کی تبدیلی، پیدا نہ ہو تو انسان کی نہ صرف طبیعت پتھریلی ہو جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات اس کی خوبیاں بدل کر خرابیوں میں بدلنے لگتی ہیں۔ مدتی غریبی اور غیرت کے ہاتھوں پسنے والے نادار طبیعتاً کنجوس ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کے حالات خوشگوار بھی ہو جائیں تو ان کا بٹوہ نہیں کھلتا۔ وہ دوسروں کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر چڑتے رہتے ہیں اور ان کے نزدیک صاف ستھری خواہشیں بھی قابل احترام نہیں رہتی۔ اپنی خواہشات پر صبر کا ڈھکنا تا دیر بند رکھنے سے وہ اپنے نفس پر ظلم کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ لوگ جنہوں نے مدتوں سخت حالات کا مقابلہ کیا، وہ شقی القلب بھی ہو جاتے ہیں۔ انہیں نہ اپنے پر ترس آتا ہے، نہ دوسروں کے آنسو گرتا دیکھ کر انکے دل پگھلتے ہیں۔ اگر ڈاکٹروں ہی کی مانند یہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک بھی رہیں تو بھی انکے دل پسیجتے نہیں اور ان میں رقت پیدا نہیں ہوتی۔ اس طرح قوت برداشت اور صبر کی سل سینے پر رکھنے والے رحم دلی جیسی نعمت سے خالی ہو جاتے ہیں اور ان کی قوت برداشت کی خوبی خرابی میں بدل جاتی ہے۔ یہی زندگی کا سب سے بڑا اچنبھا ہے کہ کیسے نیکی بدی میں اور بدی نیکی میں بدلتی رہتی ہے۔ کیسے انسان کی خوبی ہی اس کی خرابی بن جاتی ہے اور اس کی خرابی ہی میں خوبی کی گنجائش رہتی ہے۔

جو عورت اپنی مجبوری یا کسی مرد کی مجبوری کی وجہ سے استحصال کا مرکز بنتی ہے۔ اگر

بار بار وہ مرد کی شہوت کا شکار ہوتی رہے اور مدتوں استحصال کا نشانہ بنی رہے تو اس کی نسائیت کی نرمی، حیا، پاک بازی جیسی خوبیاں ہولے ہولے اسے ظلم کی طرف مائل کرنے لگتی ہیں اور وہ پتھر دل بن کر مرد کا استحصال کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ مدتوں طوائف بنے رہنے سے مظلوم سے ظالم بننے کا عمل پیش آتا ہے اور وہ تمام نرم دل کیفیتیں جن سے عورت کے دل میں چراغاں رہتا ہے، اندھیرا بن کر ڈسنے لگتا ہے۔

امریکہ نے اعتدال پر آنے کے لئے تبدیلی کا نسخہ تجویز کر رکھا ہے۔ وہ "Move On" کی پالیسی پر عمل کرتے ہیں۔ سفر کو وسیلہ ظفر جان کر دور دراز ملکوں میں رمتے جوگی بن جاتے ہیں ..... امریکن طرز کہن سے چڑتا ہے، آئین نو کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اسی تبدیلی کے ہاتھوں اپنی خوبی کو خرابی میں بدل جانے سے بچاتا ہے۔ وہ وفا کو بہ شرط استواری استعمال نہیں کرتا، بلکہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ بے وفائی سے زندگی میں تازگی رہے۔ درست علاج ہو یا نہ ہو، درد کم سے کم رہے۔ وہ ماں کا دن مناتا ہے ..... باپ کا ڈے مناتا ہے۔ بوڑھے لوگوں کا سال Celebrate کرتا ہے..... لیکن انہیں اپنے پر سوار نہیں کرتا۔

امریکہ میں تبدیلی بھی ترقی کا ہی ایک راستہ ہے..... تبدیلی بہتر سے بہتر کی تلاش میں تو مدد دیتی ہے، لیکن شاید فلاح اس راستے پر نہیں ملتی۔ تبدیلی اس بات کی متقضی ہے کہ انسان میں خواہش پیدا ہو..... خواہش کبھی مرنے نہ پائے۔ خواہشات کو ابھارنے کے لئے بازاروں یک جنگل میں۔ ابلاغ ہے۔ ذرائع آمد و رفت کا لمبا چوڑا سلسلہ ہے۔ امریکی کبھی خواہش سے خالی ہونا نہیں چاہتا..... بدلتی خواہش اسے ترقی کے زینوں پر اوپر چڑھنے میں مدد دیتی ہے۔

لیکن کیا کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہوئے بغیر کوئی اصلی تبدیلی آسکتی ہے؟ کیا مسلک، مذہب، خیال، تحریک صرف علم کے سہارے ممکن ہے؟ کیا نبی کے بغیر، اس کی شفقت کی روشنی نہ ہوتے ہوئے صرف کتاب سے مذہب کی تبدیلی ممکن ہے؟ کیا

استاد، گرو، مرشد کے بغیر انسان علم کو عمل میں ڈھالنے کی تبدیلی لاسکتا ہے.....؟ ترقی اور فلاح میں تبدیلی بھی مختلف ہے۔ فلاح کے راستے پر اپنی خواہش بدلنا نہیں پڑتی، بلکہ اسے ایک ہی سمت میں رکھنا پڑتا ہے۔ اس بظاہر جامد خواہش کے باوجود فلاح پانے والا تبدیلی سے آشنا رہتا ہے، لیکن بقدر ضرورت۔ ہر وقت کی اکھاڑ پچھاڑ اس کا پیچھا نہیں کرتی۔

واشنگٹن میں جو کچھ گزری، اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ واشنگٹن سے واپسی پر میں ایک بار پھر سوالوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ بیلکونی میں بیٹھ کر میں سڑکوں پر نگاہ دوڑاتا پھر تقابلی سوچ کے حوالے ہوگیا۔ یہ سلسلہ تکلیف دہ بھی تھا اور وقت بھی اس کے سہارے آرام سے گزر جاتا تھا۔

مشرق میں ابھی تبدیلی سے اتنی محبت پیدا نہیں ہوئی۔ تبدیلی ہمیں خوفزدہ کرتی ہے ..... ہم صابرین اور شاکرین میں سے ہونا چاہتے ہیں۔ ہم مابعد اور آخرت میں اپنا حصہ لینا چاہتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کے باعث پھر کہنا پڑتا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی مل نہیں سکتے۔

امریکن خواہش کو تازہ دم کرتے ہیں۔ تبدیلی سے اپنے آپ کو انگیخت کرتے ہیں۔ خرابی اور خوبی کو ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ تبدیلی انہیں مسابقت کی طرف کھینچتی ہے۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں مبتلا رہتے ہیں۔

مشرق کو جاہل کہہ لیجئے۔ کم علم، ناعاقبت اندیش سمجھ لیجئے ..... دلدل میں دھنسا ہوا مشرقی انسان مکمل طور پر روایت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ اپنی لوک ریت، رسم و رواج سے محبت کرتا ہے ..... شاید وہ دکھ سہتا سہتا اپنی خرابیوں میں راسخ بھی ہو جاتا ہے، لیکن فلاح کی منزل دھندلاتی نہیں۔ سائنس سے دور، ہر لحظہ کی تبدیلی سے ناآشنا، اس کے صبح و شام ایک سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ مذہب سے وابستہ رہ کر صبر کی ڈھال آگے رکھ کر چلتا رہتا ہے۔ عام انسان کو مذہب کی اصلیت سے چاہے آگاہی ہو، نہ ہو

وہ قبر پرستی، تعویز گنڈے، پیر حضوری میں دن گزارتے ہوئے ہولے ہولے غلاظت کے ڈھیروں میں گزرتے ہوئے مست اور مجذوب کے مرحلوں سے واقف، جسم پر رنگ برنگ منکوں کی مالائیں سجائے فقیر کو سامنے پا کر مشرقی انسان کو اپنی تمام تر بدنصیبی کے باوجود یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا دارالمحن ہے۔ یہاں انسان کا امتحان مقصود ہے اور اصلی حیات مابعد سے شروع ہوتی ہے۔ کوئی تبدیلی سفر آسان نہیں کر سکتی۔ کسی قسم کی ترقی انسان کو مکمل طور پر پرسکون، قناعت پسند، مسرت آشنا نہیں بنا سکتی۔ جب تک اوپر والے کا فضل نہ ہو، کچھ بھی مثبت نہیں ہوتا۔

سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہ۔ دونوں الگ الگ وقت کے تابع ہیں۔

مشرق تبدیلی کا خواہاں نہیں، استواری کا دلدادہ ہے۔

مشرق میں خواہش کو دبانے کا عمل ہے مغرب میں ابھارنے کا.....

یہاں عقیدہ اہم ہے اور وہاں قاعدہ.....

دونوں میں فرق اتنا زیادہ ہے کہ یہ دونوں راضی نامہ نہیں لکھ سکتے ..... اور اگر کبھی مشرق نے مغرب کی سوچ میں ضم ہونے کی کوشش کی بھی تو اس کو مذہب سے ہاتھ دھو کر فلاح کا راستہ چھوڑ کر یہ منزل مل سکے گی..... پھر شرمندگی، احساس گناہ، بے حیائی کا نیا سفر ہوگا اور مشرقی لوگ.....

کبھی کبھی میں سوچا کرتا ہوں کیا ترقی کی اس قدر قیمت ادا کرنا درست ہے؟ کیا آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے قرضوں کی طرح معمولی انسان بھی صرف تبدیلی کی قسطیں ادا کرتا فوت ہو جائے گا.....؟ نہ ترقی حاصل کر پائے گا، نہ فلاح..... نہ حال کی ترقی اس کی ہوگی، نہ مابعد کی۔ ہم کیوں نہیں جان پائے کہ انسان کلی طور پر کبھی بھی مادیت میں ضم نہیں ہو سکتا۔ غالباً یہ مشیت کی منشا بھی نہیں۔

یہ تب کی بات ہے جب اصغری زندہ تھی اور جہانگیر شاہدہ کے گھر شفٹ نہ ہوا تھا۔

وہ دونوں ہنستے کھیلتے باہر نکلتے لیکن جب تک جہانگیر اور شاہدہ بند کمرے میں ہوتے، بڑی خوفناک آوازیں آتی رہتیں۔

''تم پکے حرام زادے ہو.....'' کونونٹ کے لب و لہجہ میں بجلی کے لشکارے جیسی آواز آتی، آگے کچھ منمنا سا جواب ملتا جیسے طالب علم کو غلط جواب نکالنے پر حساب کے استاد کا خوف دامنگیر ہو.....

''الو کے پٹھے اگر یہی تمہارا معیار زندگی تھا تو مجھے کیوں بیاہ کر لائے تھے.....؟''

باوجودیکہ دونوں کمروں کے درمیان صرف کھلے دروازے کا حجاب تھا۔ بگی داڑھی والا میں ہمایوں فرید جواب نہ سن پاتا اور اپنے بیٹے کی آواز مجھ سے پہچانی نہ جاتی۔

''اور تمہارا یہ باپ؟ ہوگا کوئی بڑا امپورٹ ایکسپورٹ والا..... مجھے اس کی تڑی نہ دینا۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی..... وہ بھی کسی ریٹائرڈ اولڈ فول سے..... میرے باپ کا تم لوگ کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے..... ہی از اے بزنس ٹائی کون..... جانتے ہو بزنس ٹائی کون کیا ہوتا ہے۔ جانتے ہو سٹوپڈ۔''

''ہم کب مقابلے کی سوچتے ہیں.....'' آگے پھر جہانگیری آواز منمنا جاتی۔

''میں دیانت داری کو نہیں جانتی۔ یہ کم عقل..... نالائق للو قسم کے لوگوں کے بہانے ہیں۔ جو نہ زندگی میں کچھ بن سکے اور نہ ہی ان کا بننے کا کچھ ارادہ ہو..... تم خوفزدہ، نن کم پوپ، چھوٹے اور ٹوٹے ہوئے آدمی ہو۔ یاد رکھو اگر تم نے جلد کچھ نہ سوچا تو میں جا بھی سکتی ہوں۔ مجھے اس گھر سے ویسے بھی کچھ نہیں لینا دینا۔ باسٹرڈ.....'' یہ میری بہو شاہدہ کا میزائلی حملہ تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے اپنا کمرہ اوپر والی منزل میں منتقل کر لیا۔ اصغری اور میں شاہدہ کی باتیں سن کر سو نہیں سکتے تھے۔ نیند کی گولیاں کھا کر بھی مجھے ساری ساری رات نیند نہ آتی۔ نیند تو غالباً جہانگیر کو بھی نہیں آتی تھی، لیکن وہ جوان تھا اور ابھی اپنی آئی ایم ایف جیسی بیوی کے آگے حال احوال بیان کرنے کا اہل تھا۔ جہانگیر اب مجھے

خمیدہ کمر Shuffle کرتا ہوا بوڑھا بوڑھا نظر آتا تھا۔

پھر اچانک جہانگیر نے ڈاکٹری چھوڑ کر مقابلے کے امتحان میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ بہار کے دن تھے۔ آڑو اور آلوچے کے شگوفے لان میں پھول رہے تھے۔ ہوا میں آزاد پرندوں کی چہک اور پھولوں کی خوشبو تھی۔ لان میں امریکی Sprinkler آہستہ آہستہ جھولتا فوارے کی طرح بوندیں چھوڑ رہا تھا۔ اس مصنوعی فوارے کی پھوار میں چڑیاں نہانے کی کوشش میں تھیں۔ کئی دنوں سے میری جہانگیر سے تفصیلی ملاقات نہ ہوئی۔ وہ دونوں ہمیں رسمی سلام کر کے اپنے پروگرام میں نکل جاتے۔

اصغری کچھ وقت ارجمند کو یاد کرنے میں بسر کرتی۔ پھر ڈرتے ڈرتے ہارون کو دیکھنے نیچے جاتی۔ اب کچھ عرصہ سے وہ ہارون کی زیارت کرنے بھی نیچے نہ گئی تھی..... اصغری کو اپنی ہائی جین پر بھروسہ نہ تھا، اس لئے وہ ہارون کو اٹھانے سے پرہیز کرتی۔

میں نائی کی دوکان پر خط بنوانے کے لئے گیا تھا، لیکن حسن اتفاق سے دوکان بند تھی۔ میں نے واپس آ کر ارجمند کا بھیجا ہوا سیل والا استرا نکالا اور اپنی بگی داڑھی کو ہموار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے دراصل عینک کے ساتھ بھی اپنا چہرہ آئینے میں صاف ستھرا نظر نہ آتا۔ عینک کا آخری نمبر بھی ناکافی تھا اور اب میں لنز کے ساتھ صبح کا اخبار پڑھتا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے استرا بند کیا۔

سامنے جہانیر کھڑا تھا۔ جب اس کی شادی ہوئی تو اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا۔ رنگ سفیدی مائل گندمی آنکھیں روشن اور مسکراتی ہوئی۔ اب وہ درمیانے قد، سانولے چہرے اور اداس آنکھوں والا نوجوان تھا۔ باڈی بلڈنگ کے شوقین جہانگیر کے کندھے خمیدہ، دانت زرد اور ناخن میلے تھے۔ اسے دیکھ کر پوست منحوسیت کا خیال آتا۔

''آؤ آؤ.....''

''آپ داڑھی Trim کر رہے تھے بابا.....''

''ہاں ہاں..... بڑا مزہ آتا ہے۔خلیفہ کے پاس جانا نہیں پڑتا۔کم از کم ایک سہارے سے چھٹی ملی.....''

''میں آپ کا خط بنادوں.....''

''نہیں نہیں..... میں تو ایسے ہی شوقیہ داڑھی بناتا ہوں،ورنہ وہ خلیفہ رزاق بڑا اچھا خط بنادیتا ہے.....''

''کچھ زیادہ ہی اچھا بنادیتا ہے آپ کا خط۔مولوی سے نظر آتے ہیں۔میں ٹرم کر دوں داڑھی،فرانسیسی شاعر لگیں گے؟''

میں جی سے چاہتا تھا کہ جہانگیر میرا خط بنادے،لیکن اندر ہی اندر شاہدہ سے پتہ کیوں خوفزدہ تھا۔نہ جانے اسے اچھا لگے یا نہ لگے..... نہ جانے یوں باپ بیٹے کے قریب آنے پر وہ کیا سمجھے؟ میں کچھ اسے بخار رہا ہوں۔اپنے جال میں پھنسا رہا ہوں۔

''میں آپ سے مشورہ لینے آیا تھا..... ایک''

''ضرور ضرور.....''ہنس کر میں نے کہا.....''اس عمر میں ہم اور دے بھی کیا سکتے ہیں۔ہمارے پاس سوائے مشورے کے اور دینے والی کون سی چیز ہے؟ آؤ بیٹھو.....''

''وہ جی میں نے سوچا ہے کہ میں..... سی ایس ایس کرلوں..... میں..... شاید اچھا ڈاکٹر ثابت نہیں ہوسکتا..... پھر نہ اس میں اتھارٹی ہے نہ پیسہ.....''

میں غسل خانے سے نکل کر باہر آگیا۔مجھے جوانی والی اصغری بھول چکی تھی،لیکن اتنا ضرور یاد تھا کہ جہانگیر کی تعلیم کے لئے جوان اصغری نے بڑے پاپڑ بیلے تھے۔اسے ڈاکٹری تک پہنچانا پھر ہاؤس جوب کے لئے سفارشیں تلاش کرنا..... شادی کا مرحلہ یہ اصغری جیسی دھان پان کے لئے ماؤنٹ ایورسٹ فتح کرنے کے مصداق تھا۔خیر شادی تو جہانگیر نے اپنی مرضی سے اپنی ہی ہم جماعت سے کی،لیکن اسے ڈاکٹر بنانے میں ہم میاں بیوی کے کئی سال امید و بیم میں کٹے۔اپنی کئی خوشیاں قربان کرنے کے